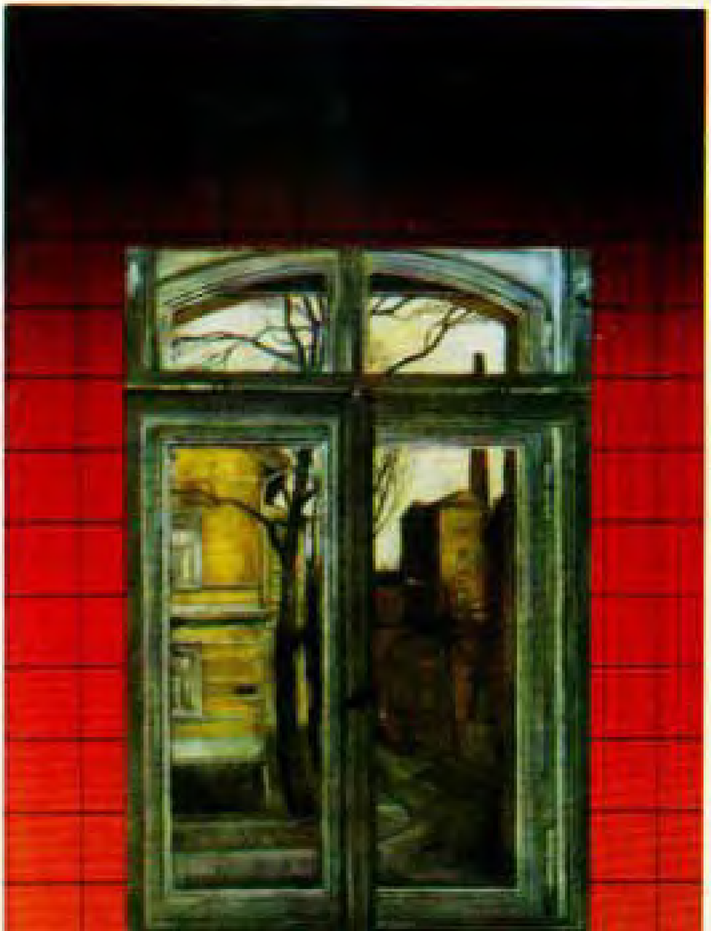
تنہا تنہا

احمد فراز



ترتیب

ب

شاعر

جس آگ سے جی آج جل اُٹھا ہے اچانک
پہلے بھی مرے سینے میں بیدار ہوئی تھی
جس کرب کی شدت سے مری روح ہے بیکل
پہلے بھی مری زیست کا آزار ہوئی تھی
جس سوچ سے مَیں آج لہو تھوک رہا ہوں
پہلے بھی مرے حق میں یہ تلوار ہوئی تھی

وہ غم، غمِ دنیا جسے کہتا ہے زمانہ
وہ غم، مجھے جس غم سے سروکار نہیں تھا
وہ درد کہ ہر دور کے انسان نے جھیلا
وہ درد مرے عشق کا معیار نہیں تھا
وہ زخم کہ ہر سینے کا ناسور بنا تھا
وہ زخم مجھے باعثِ آزار نہیں تھا

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس غمِ ذات میں گُم تھا
آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
لیکن مرا دل اپنے ہی حالات میں گُم تھا
میں وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دور
جام و مے و مینا و خرابات میں گُم تھا

دربار کی تفریح کا ساماں تھا مرا فن
ہاتھوں میں مرے ظرفِ گدا لب پہ غزل تھی
شاہوں کی ہوا خواہی مرا ذوقِ سخن تھا
ایوانوں کی توصیف و ثنا اوجِ عمل تھی
اور اس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
ورنہ مرا انعام فقط تیغِ اجل تھی

چھیڑے کبھی میں نے لب و رخسار کے قصے
گاہے گل و بلبل کی حکایت کو نکھارا
گاہے کسی شہزادے کے افسانے سنائے
گاہے کیا دنیائے پرستاں کا نظارا
میں کھویا رہا جن و ملائک کے جہاں میں
ہر لحظہ اگرچہ مجھے آدم نے پکارا!

برسوں یونہی دل جمعیِ اورنگ کی خاطر
سو پھول کھلائے کبھی سو زخم خریدے
میں لکھتا رہا ہجو بغاوت منشوں کی
میں پڑھتا رہا قصر نشینوں کے قصیدے
اُبھرا بھی اگر دل میں کوئی جذبۂ سرکش
اِس خوف سے چپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

لیکن یہ طلسمات بھی تا دیر نہ رہ پائے
آخر مے و مینا و دف و چنگ بھی ٹوٹے
یوں دست و گریباں ہوئے انسان و خداوند
نخچیر تو تڑپے قفسِ رنگ بھی ٹوٹے
اِس کشمکشِ ذرّہ و انجم کی فضا میں
کشکول تو کیا افسر و اورنگ بھی ٹوٹے

یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے محبوب آقا کی تعریف و توصیف میں
آسمان و زمیں کو ملائیں
کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں
کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ تو ہیں عہدے میں ایوانِ شاہی کے جاروب کش سے بھی کمتر
انھیں کیا کوئی آئے یا کوئی جائے
کہ اُن کا فریضہ تو ہے صرف آقائے حاضر کی خدمت گزاری
کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش
تو پھر مصلحت ہے اسی میں
کہ اپنے قصیدوں سے آقائے نو کا کریں خیر مقدم ۔

طواف منزل جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
فراز تم بھی اگر تھوڑی دور ساتھ چلو

راتیں ہیں اُداس دن کڑے ہیں
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں

اے یادِ حبیب ساتھ دینا
کچھ مرحلے سخت آ پڑے ہیں

رُکنا ہو اگر تو سو بہانے
جانا ہو تو راستے بڑے ہیں

اب کیسے بتائیں وجہِ گریہ
جب آپ بھی ساتھ رو پڑے ہیں

اب جانے کہاں نصیب لے جائے
گھر سے تو فراز چل پڑے ہیں

○

لے اُڑا پھر کوئی خیال ہمیں
ساقیا ساقیا سنبھال ہمیں

رو رہے ہیں کہ ایک عادت ہے
ورنہ اِتنا نہیں ملال ہمیں

خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم
آئینے کی طرح سنبھال ہمیں

مرگِ انبوہ جشنِ شادی ہے
مل گئے دوست حسبِ حال ہمیں

اختلافِ جہاں کا رنج نہ تھا
دے گئے مات ہم خیال ہمیں

کیا توقع کریں زمانے سے
ہو بھی گر جرأتِ سوال ہمیں

ہم یہاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن
اپنی محفل سے مت نکال ہمیں

ہم ترے دوست ہیں فراز مگر
اب نہ اور اُلجھنوں میں ڈال ہمیں

ہم ہیں ظلمت میں کہ اُبھرا نہیں خورشید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سنتا تھا حدیثِ غمِ دل یوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

پی گئے رند کہ نایاب ہے صہبا ورنہ
زہر تھی محتسبِ شہر کی تنقید اب کے

تشنگی وجہِ جنوں ہے تو چلو یوں ہی سہی
کوئی سنگ آئے سرِ ساغرِ جمشید اب کے

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یاروں نے بڑھ کر
قاتل کو پکارا کبھی مقتل میں صدا دی
گاہے رسن و دار کے آغوش میں جھولے
گاہے حرم و دیر کی بنیاد ہلا دی
جس آگ سے بھرپور تھا ماحول کا سینہ
وہ آگ مرے لوح و قلم کو بھی پلا دی

اور آج شکستہ ہُوا ہر طوقِ طلائی
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہُنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

حضور مسکرا رہے ہیں میری بات بات پر
حضور کو نہ جانے کیا گماں ہے میری ذات پر

حضور منہ سے بڑھ ہی ہے پیک صاف کیجیے
حضور آپ تو نشے میں ہیں معاف کیجیے

حضور کیا کہا، میں آپ کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کرم ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں

حضور چھوڑیے ہمیں ہزار اور روگ ہیں
حضور جائیے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں

○

تیری باتیں ہی سُنانے آئے
دوست بھی دل ہی دُکھانے آئے

پھول کِھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

ایسی کچھ چُپ سی لگی ہے جیسے
ہم تجھے حال سُنانے آئے

عشق تنہا ہے سرِ منزلِ غم
کون یہ بوجھ اُٹھانے آئے

اجنبی دوست ہمیں دیکھ، کہ ہم
کچھ تجھے یاد دلانے آئے

دل دھڑکتا ہے سفر کے ہنگام
کاش پھر کوئی بلانے آئے

اب تو رونے سے بھی دل دکھتا ہے
شاید اب ہوش ٹھکانے آئے

کیا کہیں پھر کوئی بستی اُجڑی
لوگ کیوں جشن منانے آئے

سو رہو موت کے پہلو میں فراز
نیند کس وقت نہ جانے آئے

○

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

جل رہے ہیں ہرے بھرے گلزار
غم ہوا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ رہی ہے شکستگی دل کی
تھا مکینوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشۂ دل میں
ایک دنیائے بیکراں آباد

چند منظر اُجاڑنے والو
ہو رہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر جلا کر نہ رو محبت میں
یہ تو ہوتا ہے خانماں آباد

کتنے تارے فرازؔ ٹوٹ چکے
ہے ابھی تک یہ خاکداں آباد

کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں
جو دشت والے تھے وہ بھی اُٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کہ ڈھونڈتے ہیں
ہم اپنے دیس کی باتیں پرائے شہروں میں

کچھ اِس طرح سے ہر اک بام و در کو دیکھتے ہیں
زمانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سُنا ہے جب بھی لُٹی ہے بہارِ ویرانہ
تو چندا اور چمن مسکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ ہُوئے تلخ تجربے ہم بھی
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

فرازؔ ہم وہ غزالانِ دشت و صحرا ہیں
اسیر کر کے جنہیں لوگ لائے شہروں میں

○

دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمنِ جانِ بہار
زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکانِ بہار

نشۂ احساسِ خوش وقتی نے اندھا کر دیا
برق بھی چمکی تو ہم سمجھے چراغانِ بہار

خون رُلواتے ہیں سب کو اپنے اپنے تجربے
وہ پشیمانِ خزاں ہوں یا پشیمانِ بہار

اب کے کچھ ایسی ہی بن آئی کہ ہم معذور ہیں
ورنہ کب پھیرا تھا ہم نے کوئی فرمانِ بہار

اے خوشا عہدِ خزاں جب نغمہ پیرائی تو تھی
اب تو سُرمہ در گلو ہیں خوشنوایانِ بہار

گر یونہی بادِ صبا اٹکھیلیاں کرتی پھری
شعلۂ گُل سے بھڑک اُٹھے گا دامانِ بہار

کب مجھے دل تنگ ہم زنداں میں رہ کر بھی فراز
ہاں مگر جب آ گئی ہے یادِ یارانِ بہار

ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے
کہ شہرِ حُسن میں جلووں کی قحط سالی ہے

کہاں ہے دوست کہ آشوبِ ہجر سے میں نے
ترے خیال کی آسودگی بچالی ہے

بتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ سناٹا
افق سے پھر کوئی آندھی اُترنے والی ہے

لرز رہے ہیں شگوفے چمن میں کھلتے ہوئے
حنائے دستِ صبا میں لہو کی لالی ہے

پیو شراب کہ ناصح نے زہر بھی دے کر
ہماری جرأتِ رندانہ آزمالی ہے

پھر آج دانۂ گندم کے سلسلے میں فراز
کسی خدا نے مری خلد بیچ ڈالی ہے

ہر شاخِ چمن کی جل رہی ہے
کیا بادِ مراد چل رہی ہے

ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں
دنیا ہے کہ چال چل رہی ہے

یوں دل میں ہے تیری یاد جیسے
ویرانے میں آگ جل رہی ہے

رُخ پھیر لیا ہے جب سے تُو نے
دنیا کی نظر بدل رہی ہے

درپیش ہے آج بھی وہ صورت
جو صورتِ حال کل رہی ہے

اِتنی بھی فراز بد دلی کیا
سنبھلو! کہ فضا بدل رہی ہے

بانو کے نام*

ملوکیت کے محل کی گنہگار کنیز
وہ جُرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف
تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
ہر ایک جبر کو تُو سہہ گئی بطیبِ دلی

* وہ کم سن کنیز جسے بیگم جوناگڑھ نے قتل کروایا۔

یہی سُنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تُو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی نے زر و سیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اِس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسمِ تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اُونچے محلات کے بھرم کے لیے
ہر ایک دَور میں تزئینِ طوق و دار ہوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انار کلی
کبھی شگفتہ پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مورّخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بہ فیضِ وقت اگر کوئی راز کھل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کجکلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

مجسمہ

اے سیہ فام حسینہ ترا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دورِ الم ناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے

تیرے شب رنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربوط خیالات کے تانے بانے
یہ تری سانولی رنگت یہ پریشاں خطوط
بارہا جیسے مٹایا ہو انھیں دنیا نے

ریشۂ سنگ سے کھینچی ہُوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہیں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں اُلجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ سناٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے سستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے
ریگزارانِ حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ روحوں کے ہوسناک تعیش کے لیے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

○

نشۂ گیسوئے شب تاب کہاں
آنکھ کھل جائے تو پھر خواب کہاں

جی جلاتے ہیں سحر کے جھونکے
کھو گئے چشمۂ مہتاب کہاں

شہر سنسان ہے صحرا کی طرح
اب وہ ہنگامۂ احباب کہاں

سطحِ دریا تو ہے ہموار مگر
بستیاں ہو گئیں غرقاب کہاں

تلخیِ سم ہے لبوں کے مس تک
کوئی پی جائے تو زہراب کہاں

عشق اِک کوہِ گراں تھا پہلے
اب محبت کے وہ آداب کہاں

اب کہاں اہلِ وفا ملتے ہیں
پہلے ہم لوگ تھے نایاب کہاں

اب تو دھڑکن سے بھی جی ڈرتا ہے
اب یہ دل پارۂ سیماب کہاں

ق

ہم بھی کہتے تھے چراغانِ بہار
لیکن اب آنکھوں میں خوں ناب کہاں

ہم کو بھی لذتِ غم تھی پیاری
لیکن اب جی میں تب و تاب کہاں

اب بھی پایاب نہیں موجۂ غم
پھر بھی اندیشۂ سیلاب کہاں

○

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فراز آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فراز پنکھڑی تھی

مسیحا

میری افسردگی سے پریشاں نہ ہو
تو مری تلخیوں کا سبب تو نہیں
تیری آنکھیں تو میری ہی دمساز ہیں
تھیں کبھی اجنبی لیکن اب تو نہیں
تجھ کو میری مسرت مقدم سہی
تیرا غم مجھ کو وجہِ طرب تو نہیں

تیرا احساں ہے تُو نے میرے لیے
اپنی پلکوں سے راہوں کے کانٹے چُنے
خود کڑی دھوپ میں رہ کے میرے لیے
تُو نے زلفوں کے شاداب سائے بُنے
میری خاطر زمانے کو پاگل کہا
میری خاطر زمانے کے طعنے سُنے

تُو مری زندگی ہے مگر جانِ من!
اب وہ عشق و محبت کی رسمیں نہیں
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں
جن کا درماں تری دسترس میں نہیں
ایک غم جس کی شدت ہمہ گیر ہے
تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

تشنگی

دیکھو پگھلا پگھلا سونا بہ نکلا کہساروں سے
دیکھو نازک کرنیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پہ
دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے
دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے جھیلوں پہ
تم بھی ششدر ششدر سپنوں کی لہروں پہ بہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو
اور ذرا رہ جاؤ

سلگا سلگا موسم ہے شعلوں کی دہکتی حدت سے
چڑھتے سورج کے سائے میں ساری دنیا جلتی ہے
دہک دہک اُٹھی ہیں سڑکیں تپتی دھوپ کی شدت سے
ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لُو چلتی ہے
اِس کو بھی اک جبرِ مشیت سمجھو اور سہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو
اور ذرا رہ جاؤ

دیکھو چاروں طرف ٹھنڈے سائے لہراتے ہیں
تارے نکھرے موتی بکھرے شام کا جادو قائم ہے
خنک خنک پھولوں کے جھونکے خوشبوئیں برساتے ہیں
ٹھیک ہے تم کو جانا ہے پر ایسا بھی کیا لازم ہے
ٹھہرو کچھ باتیں ہم سے سن لو پھر تم گھر جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو
اور ذرا رہ جاؤ

○

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
ترے فراق کے دُکھ یاد آنے لگتے ہیں

ہمیں ستم کا گلہ کیا، کہ یہ جہاں والے
کبھی کبھی ترا دل بھی دُکھانے لگتے ہیں

سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

پلک جھپکتے ہی دُنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنھیں بستے زمانے لگتے ہیں

فرازؔ ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

○

کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اِک دَور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

بے مہریِ حیات کی شدت کے باوجود
دل مطمئن تھا جب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

میں اور تقابلِ غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

اِک خواب ہو گئی ہے رہ و رسمِ دوستی
اِک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

وہ بزمِ دوست یاد تو ہو گی تمھیں فرازؔ
وہ محفلِ طرب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

○

رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے
آپ آئے بھی مگر رونے کے عادی روئے

اُن کے آ جانے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو
اُن کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے

ہائے پابندیِ آداب تری محفل کی
کہ سرِ راہ گزر رونے کے عادی روئے

ایک تقریبِ تبسّم تھی بہاراں لیکن
پھر بھی آنکھیں تھیں تر رونے کے عادی روئے

دردمندوں کو کہیں بھی تو قرار آ نہ سکا
کوئی صحرا ہو کہ گھر رونے کے عادی روئے

اے فراز ایسے میں برسات کٹے گی کیوں کر
گریۂ شام و سحر رونے کے عادی روئے

○

اُن کے وعدوں پہ یقیں لوگ بھی دیوانے ہیں
اک فقط میں ہی نہیں لوگ بھی دیوانے ہیں

میری وحشت ہی سہی موردِ الزام مگر
اے مری زہرہ جبیں لوگ بھی دیوانے ہیں

گردشِ جام کہاں گردشِ ایام کہاں
یہ خرابات نشیں لوگ بھی دیوانے ہیں

آپ تو حاصلِ ایمانِ دو عالم ہیں حضور
آپ اور دشمنِ دیں لوگ بھی دیوانے ہیں

اِک ملاقات سرِ رہ بھی سہی جرم مگر
ہم کہیں آپ کہیں لوگ بھی دیوانے ہیں

دردمندانِ محبت تو ہیں بدنام فراز
ورنہ کچھ یہ بھی نہیں لوگ بھی دیوانے ہیں

ایبٹ آباد

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہرِ سبزہ و گل
جہاں گھٹائیں سرِ رہگزار جھومتی ہیں
جہاں ستارے اُترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پہاڑوں کی قوسیں فلک کو چومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبو میں
چنار و سرو کی پرچھائیاں سی گھومتی ہیں

ابھی تلک ہیں نظر کے نگار خانے میں
وہ برگِ گُل سے تراشے ہُوئے بہشت سے جسم
وہ بولتے ہُوئے افسانے الف لیلیٰ کے
وہ رنگ و نور کے پیکر وہ زندگی کے طلسم
اور ایسی کتنی ہی رعنائیاں کہ جن کے لیے
خیال و فکر کی دنیا میں کوئی نام نہ اِسم

ابھی تلک ہیں تصوّر میں وہ در و دیوار
بسیط دامنِ کہسار میں چناروں تلے
جہاں کسی کی جواں زلف بارہا بکھری
جہاں دھڑکتے ہُوئے دل محبتوں میں ڈھلے
عجیب تھی وہ جھروکوں کی نیم تاریکی
جہاں نظر سے نظر جب ملی چراغ جلے

میں لوٹ آیا ہوں اُس شہرِ سبزہ و گُل سے
مگر حیات انھیں ساعتوں پہ مرتی ہے
مجھے یقیں ہے گھنے بادلوں کے سائے میں
وہ زلف اب بھی مری یاد میں بکھرتی ہے
چراغ بجھ بھی چکے ہیں مگر پسِ چلمن
وہ آنکھ اب بھی مرا انتظار کرتی ہے

تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لیے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں کہ سورج بجھ گئے
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدتیں گزریں اِسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ ناواقف ، فضا بیگانہ ، ہم نا آشنا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلقِ شبنم کے لیے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فرازؔ
دوست دشمن کا نکل آیا ہے اپنا آشنا

ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اُڑاتی ہے صبا
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موجِ رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ مغاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پسِ رَہ
منزلِ ہم سفراں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تجھ سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسر تھی فرازؔ
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

○

سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اُٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمھارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

جو بزمِ دوست سے اُٹھ کر چلے بزعمِ تمام
کوئی پکار دے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نور بجھنے لگا!
ذرا تو اُٹھو اب اس کی گلی سے جائیں بھی

○

وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے
دل جن سے مآلِ کار ٹوٹے

ہو ختم کشا کشِ زمانہ
یا دامِ خیالِ یار ٹوٹے

پھر تجھ پہ یقیں کریں ہیں
وہ دل جو ہزار بار ٹوٹے

کھائیں گے فریب ہم خوشی سے
پر یوں کہ نہ اعتبار ٹوٹے

کانپ اُٹھے فرازؔ دونوں عالم
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے

○

انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چُپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چُپ ہیں

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل
روتے ہُوئے بیمار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

ساقی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی ترے میخوار بڑی دیر سے چُپ ہیں

یہ برق نشیمن پہ گری تھی کہ قفس پر
مرغانِ گرفتار بڑی دیر سے چُپ ہیں

اِس شہر میں ہر شخص بنی یوسفِ کنعاں
بازار کے بازار بڑی دیر سے چُپ ہیں

خریدار

دلِ بے تاب کی موہوم سی تسکیں کے لیے
اِک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا
آج کی رات بھی تُو اپنے دریچے کی طرف
حسبِ معمول نئی شان سے اِستادہ ہے
"تیرستے میں تری آنکھوں میں اشارے کیا کیا"
دیدنی ہے ترے جلووں کی نمائش لیکن
اب یہ عالم ہے کہ احساسِ تہیدستی سے
تیرے زینے کی طرف تیرے دریچے کی طرف
پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتیں!

خیر مقدم

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا
کہ پھر آج وہ ساعتِ جانستاں آگئی ہے
جب اُن سے کوئی اُن کا آقا جُدا ہو رہا ہے
وہ آقا ؟
کہ جس کی مسلسل کرم گستری سے
کوئی خادمِ خاص ہو یا کہ ادنیٰ ملازم
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا
وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں سے
حاتم کے مفروضہ قصّے بُھلائے

اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کُو بکُو بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا
مگر پھر بھی ہر سمت امن و اماں تھا

اگرچہ جہانگیر کی طرح اُس نے
کوئی ایسی زنجیرِ زر قصرِ شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی
جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اٹھاتی
مگر پھر بھی ہر گھر میں عدل و مساوات کا سائباں تھا
اگرچہ کبھی وہ جھروکے میں بیٹھے
رعایا کو رُوئے مبارک کے درشن سے مجبور سجدہ نہ کرتا
مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا
وہ جانِ جہاں تھا بڑا مہرباں تھا
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ آخر وہ لمحات بھی آگئے ہیں
جب اُن سے بچھڑنے کو ہے اُن کا دیرینہ آقا
تو وہ آج اُسے کون سا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش
جس سے رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو

اپنے وفادار و پاپوش بردار خادم
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ یوں تو عہدے میں ہیں
قصرِ شاہی کے جاروب کش سے بھی کہتر
مگر عالمِ کلک و قرطاس کے بادشاہ ہیں
وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے
ذرّوں کو ہم رُتبۂ مہر و مہتاب کر دیں
وہ چاہیں تو اپنے تخیّل کے جادو سے
صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں
وہ چاہیں تو اپنے کمالِ بیاں سے
فقیروں کو اورنگ و افسر کا مالک بنا دیں
وہ چاہیں تو اپنے فسونِ زباں سے
محلات کے بام و دیوار ڈھا دیں
وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں
کہ وہ عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں

اے بھوکی مخلوق

(۱۴- اگست ۱۹۵۸ء)

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہر پنہ
پھر بھی تیری رُوح بجھی ہے اور تقدیر سیہ

پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق
اے بھوکی مخلوق

بیس نہ سو نہ ہزار نہ لاکھ ہیں پورے آٹھ کروڑ
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور
مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور
کھیت تو سونا اگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج
تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج
گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق
اے بھوکی مخلوق

آج گرفتہ دل تو کیوں ہے تو بھی جشن منا
آنسو گر نایاب ہیں اپنے لہو کے دیئے جلا
پیٹ پہ پتھر باندھ کے اِس شب ننگا ناچ دکھا
آج تو ہنسی خوشی کا دن ہے آج یہ کیسا سوگ
تیری بہاریں دیکھنے آئیں دور دور کے لوگ
تیرے خزانے پل پل لوٹیں کتنے ہی فاروق
اے بھوکی مخلوق

○

قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا
دائم آباد رہے شہر ترا

دل ہے یا شہرِ خموشاں کوئی
نہ کوئی چاپ نہ دھڑکن نہ صدا

آخرِ عشق کی رُسوائی سے
اب ہُوا چرچا تو گھر گھر ہوگا

تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہوگا

وہم تھا قافلۂ ہم سفراں
مُڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

شبِ تیرہ ہی غنیمت تھی فراز
چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا

قاتل کے قصے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

تنگ قبائے رخ کھلے، زریں کمرے
اُس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہی دستی پر میں شرمندہ ہوں
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

عقل کے اندھوں کی محفل میں چپ ہے فراز
کتنی سیانی اِس پاگل کی باتیں ہیں

کس قدر آگ برستی ہے یہاں
خلق شبنم کو ترستی ہے یہاں

صرف اندیشۂ افعی ہی نہیں
پھول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں

رُخ کدھر موڑ گیا ہے دریا
اب نہ وہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ در گور ہُوئے اہلِ نظر
کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں

زیست وہ جنسِ گراں ہے کہ فرازؔ
موت کے مول بھی سستی ہے یہاں

○

ہر گام سفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کس کس کو اپنی اپنی رفاقت پہ زعم ہے
ہوتا ہے کون کون جدا دیکھتے رہو

ہر فصلِ گل ہے غیر یقینی سی اِن دنوں
صرصر چلے کہ بادِ صبا دیکھتے رہو

سُنتے رہو کہ وقت سنے بدلی ہے رُت نئی
دم بھر میں انقلاب ہُوا دیکھتے رہو

تھا کل تو ایک نعرۂ منصور بھی گراں
اور اب کہ سینکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

یارو پلک جھپکتے ہی لُٹتے ہیں قافلے
یاں خود کُشی ہے لغزشِ پا دیکھتے رہو

احباب کوئے دار و رسن تک پہنچ گئے
اور تم فرازؔ دستِ صبا دیکھتے رہو

کٹھن ہے راہگزر تھوڑی دُور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دور ساتھ چلو

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

نشے میں چور ہوں میں بھی تمہیں بھی ہوش نہیں
بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دُور ساتھ چلو

ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغ راہوں کے
ابھی ہے دُور سحر تھوڑی دُور ساتھ چلو

طوافِ منزلِ جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
فرازؔ تم بھی اگر تھوڑی دُور ساتھ چلو

لختئ*

ادھ کٹے بالوں پہ افشاں کے ستارے لرزاں
کھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
سرد و بے جان سے چہرے پہ تھرکتی آنکھیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

---

* سرحد کے وہ رقاص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ بنا کر ناچتے ہیں۔

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام اُمنگ
کسی سوکھی ہوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی گراں رفتار
خشک ہوتی ہوئی ندی کا بہاؤ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشواز پہ باہوں کی اُڑان
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
چند لمحوں کے لیے دائرے بن جاتے ہیں

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
ریگزاروں سے عرق پھوٹ رہا ہو جیسے
جھنجھناتے ہوئے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
دور اِک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب

منجمد، ساکن و حیراں ہیولے کی طرح

چند تانبے کے تراشے ہوئے سکّوں کے عوض

ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

ایک منظر

دُور کچھ ماتمی نعروں سے فضا گونج اُٹھی
چند مجذوب سے لوگوں کا الم کوش گروہ
(کچھ سیہ پوش تماشائی بہ اندازِ جلوس)
چادرِ گُل سے سجائے ہُوئے اعلام لیے!
دمبدم نیند میں ڈوبے ہُوئے کوچوں کی طرف
چیختا پیٹتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

یک بیک کھلنے لگے بند دریچوں کے کواڑ
چلمنیں کانپتی بانہوں کے سہارے اُٹھیں
جیسے دم توڑتے بیمار کی بوجھل پلکیں
اور کئی مضطرب و بے تاب دمکتے چہرے
ایک دلچسپ و الم ناک تماشے کے لیے
تنگ و تاریک جھروکوں کے گھنے پردوں سے
نور کے چشموں کی مانند اُبل آئے ہیں

○

دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو

لذتِ غم بھی عجب نشہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

زندگی سلسلۂ خوابِ طرب
سایۂ زلف میں سو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے احساس کی موت
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

کتنا دلکش ہے جہانِ گزراں
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو

ماہ و انجم بھی تھے آباد کبھی
اِن خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو

ریشۂ گُل میں بھی ہے موجۂ خوں
خار کی نوک چبھو کر دیکھو

اوس کی بوند بھی ہے شیشہ نگر
آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شب کے سنّاٹوں میں وہ بات کہاں
دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

تم بگولوں کے خداوند سہی
آتشِ گل تو فزوں کر دکھیو

جو دیے ے کے نکلتے ہیں فراز
وہ بھی کھا جاتے ہیں ٹھوکر دکھیو

منسوبہ سے!

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تجھ کو
کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلّو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا
کالے بازار میں نیلام اُٹھا کر تیرا
سبز باغوں کے تصور پہ تجھے تول دیا

جو سجائی گئی فردوس نمائش کے لیے
وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں
یہ مکانات، یہ جنگل، یہ دکانیں، یہ زمیں
میرے اجداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں

میں تو آوارہ سا شاعر ہوں مری کیا وقعت
ایک دو گیت پریشاں سے گا لیتا ہوں
گاہے گاہے کسی ناکام شرابی کی طرح
ایک دو زہر کے ساغر بھی چڑھا لیتا ہوں

تو کہ اِک وادیِ گلرنگ کی شہزادی ہے
دیکھ بیکار سے انساں کے لیے وقف نہ ہو
تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی دولت ہے
ایک انجان سے طوفاں کے لیے وقف نہ ہو

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتۂ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ اِن کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اُتر جائے گی

○

جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات بہ مجبوریِ دل
ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا کیا
پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے

وہ سفینے جنھیں طوفاں نہ ملے
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر ہنستے ہوئے تاروں نے
اُن کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے

کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فرازؔ
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

○

اداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں
فرازؔ انجمنِ دوست سے چلو جائیں

نہ اجنبی، نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکار و کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

جو صدمے ہم پہ گزرنے ہیں وہ تو گزریں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو جائیں

اُلجھتے ہیں ترے سودائیوں سے اہلِ خرد
یہ سادہ لوح بھی پاگل کہیں نہ ہو جائیں

زمانہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو جائیں

شبِ فراق تو کٹتی نظر نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤ فرازؔ سو جائیں

کچھ نہ کسی سے بولیں گے
تنہائی میں رو لیں گے

ہم بے راہ رووں کا کیا
ساتھ کسی کے ہو لیں گے

خود تو ہوئے رسوا لیکن
تیرے بھید نہ کھولیں گے

جیون زہر بھرا ساگر
کب تک امرت گھولیں گے

ہجر کی شب سونے والے
حشر کو آنکھیں کھولیں گے

پھر کوئی آندھی اُٹھے گی
پنچھی جب پر تولیں گے

نیند تو کیا آئے گی فراز
موت آئی تو سولیں گے

سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں
وہ زخمۂ رگِ جاں توڑ کر نکلتے ہیں

حضور آپ شب آرائیاں کریں لیکن
فقط نمودِ سحر تک چراغ جلتے ہیں

اگر فضا ہے مخالف تو زلف لہراؤ
کہ بادبان ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں
کہ واقعات ابھی کروٹیں بدلتے ہیں

یہ پاسِ پیرِ مغاں ہے کہ ضعفِ تشنہ لبی
نشہ نہیں ہے مگر لڑکھڑا کے چلتے ہیں

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فرازؔ
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

صرّاف

ساٹھ کے تیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
کسی پتھر پہ رگڑ اِس کو کسوٹی پہ پرکھ
ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اک طور سے دیکھ

مجھ پہ روشن ہے کہ اِس جنسِ گرانمایہ کو
میرے افلاس نے کم زرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے

جانتا ہوں تیری دوکاں کے یہ زریں زیور
یہ گلوبند یہ کنگن یہ طلائی چھیے
یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری
کسی شداد کا تابوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کے لیے
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیے
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں
پہلے تو رہن کیے بعد ازاں بیچ دیے

تیری میزاں کے یہ بے رحم سنہرے پلڑے
ایک جلاد کی تلوار رہے ہیں اب تک
گرسنہ آنکھوں کے کشکول ہوس کے متقل
بہرنے خوں کے خریدار رہے ہیں اب تک

ساٹھ کے تیس نہیں، تیس کے تیرہ ڈے ڈے

اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا

آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر

میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

منصور

وہ کیا خطا تھی ؟

کہ جس کی پاداش میں ابھی تک

میں قرنہا قرن سے شکارِ عبودیت

طوق در گلو — پا بہ گل رہا ہوں

وہ جرم کیا تھا ؟

کہ زندگی بھر تو میں

ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزراتا رہا

اور اس کا ثمرہ ملے

تو بس کاسۂ گدائی - عذابِ عالم
تو کیا مری بے طلب ریاضت - مجاہدت کا یہی صلہ ہے
مجھے گِلہ ہے
خدائے تخور و آبِ سادہ مجھے گِلہ ہے
مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا ملا ہے ؟
کہاں ہے وہ تیرا دستِ فیاض جس کے جود و سخا کے قصے
سنہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے حاشیے بن کے رہ گئے ہیں
کہاں ہیں وہ تیری جنتیں جن کی داستانیں
بڑے تکلف سے عرش سے فرش پر اُتاریں
کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شہد و شکر کے بے انتہا ذخیرے
کہ جن کی کاذب جھلک سے تُو نے
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا
کہاں ہیں اُن دائمی کھلونوں کے اُونچے بازار کس طرف ہیں
میں اِن روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تُو نے

زمیں پہ بغض و عناد و ظلم و فساد و حرص و ہوس کے ایسے
دُھوئیں اُڑائے
کہ نسلِ آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے
یہ وحدہٗ لاشریک دُنیا ہزار خطّوں میں کٹ گئی ہے

اگرچہ روزِ الست سے لے کے اب تلک
بے شمار صدیوں کے فاصلے ہیں
مگر یہ تاریخ کی کٹھن سال راہبہ، جو
ترے کلیساؤں، بتکدوں اور حرم سراؤں کے مجرمانہ رموز سے
آشنا رہی ہے
ہر اک خرابے کی خاک اُڑانے کے بعد آئی تو کہہ رہی ہے
"دشت نشینوں کے باسیو!
یہ جہاں تمھارا ہے
یہ زمیں یہ فلک یہ خورشید و ماہ و انجم فقط تمھارے ہیں
دوسرا ماسوا تمھارے کوئی نہیں ہے

خدا و بندہ کی تلخ تفریق بے حقیقت ہے بے سبب ہے
الوہیت کا وجود تم میں سے ہی کسی خود فریب انساں کا واہمہ تھا
یہ واہمہ اِس قدر بڑھا پھر
کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے
اور اسس خداوند
اس تصور کے آسرے پر
تمھارے کچھ ہم نفس رفیقوں نے
تم کو محکوم و پابزنجیر کر دیا ہے
یہی وہ پہلا گناہ پہلا فریب پہلا فسوں ہے جس نے
مزاجِ انساں کو غاصبانہ شعور بخشا"
اگر یہ سچ ہے!
اگر یہ سچ ہے خدائے تو رو آبِ سادہ
تو یہ من و تو کی پست و بالا فصیل مسمار کیوں نہ کر دوں
کہ اِن مراتب کی کشمکش سے ہی

آج میں اور میرے ہم جنس

اِس طرح ایک دوسرے کے غنیم ہیں

جس طرح زمستاں کی برفباری کے بعد گرگانِ گرسنہ

بھوک کی شقاوت سے تنگ آکر

اُس ایک لمحے کے منتظر ہوں

جب ان کا کوئی نحیف ساتھی غنودگی کا شکار ہو

اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر چیر پھاڑ ڈالیں

کہ اس شکم کے سبب دوزخ سے بڑھ کے کوئی نہیں جہنم

نہ اِس جہاں میں نہ اُس جہاں میں

○

غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا بھلا بُرا ہونا

خوش نگوں سارے ہم سفر بیزار
اِک ستم ہے شکستہ پا ہونا

کتنی جانکاہ ہے ضمیر کی موت
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا

نشۂ لذّتِ گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دِکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

دل کی باتوں پہ کون جائے فرازؔ
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

○

تیرے ہوتے ہُوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سُورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بُجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دُور ہُوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اُٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

تو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

○

میری حالت سے کہ احساسِ طرب ہے کوئی
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی

فتنۂ گردشِ دوراں ذرا آہستہ گزر
سایۂ زلف میں آرام طلب ہے کوئی

اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ تقریبِ طرب ہے کوئی

آج تک اُن سے رہ و رسم چلی جاتی ہے
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی سے آنسو
یا مری آنکھوں میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فرازؔ
آبدیدہ ہے کوئی خندہ بلب ہے کوئی

○

اب جو کانٹے ہیں دل میں تمناؤں کے پھول تھے
آج کے زخم پہلے شناؤں کے پھول تھے

دشتِ غربت کچھ ایسا ہُوا گُل فشاں گُل فشاں
جس طرح پھُوٹتے آبلے پاؤں کے پھُول تھے

تھی ہمیں کو بہت خارزارِ جنوں کی لگن
دوستو! ورنہ اقوال داناؤں کے پھُول تھے

غم کی لَو سے دھڑکتے دلوں کے کنوَل بجھ گئے
دھوپ میں کیسے کھِلتے وہ جو چھاؤں کے پھُول تھے

برف زاروں میں کوئی اگر یہ سماں دیکھتا
جا بجا نقشِ پا کوہ پیماؤں کے پھول سے تھے

شہر میں حسنِ سادہ کو کانٹوں میں تولا گیا
بک گئے کوڑیوں مول جوگاؤں کے پھول تھے

زہر آگیں فضا بستیوں کی جنھیں کھا گئی
ہم فراز ایسے سنسان صحراؤں کے پھول تھے

○

سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آجاؤ
بڑا اُداس سماں ہے قریب آجاؤ

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زعمِ وفا
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریب آجاؤ

رہِ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
ہجومِ ہمسفراں ہے قریب آجاؤ

جو دشتِ عشق میں بچھڑے وہ عمر بھر نہ ملے
یہاں دھواں ہی دھواں ہے قریب آجاؤ

یہ آندھیاں ہیں تو شہرِ وفا کی خیر نہیں
زمانہ خاک فشاں ہے قریب آجاؤ

فقیہہِ شہر کی مجلس نہیں کہ دُور رہو
یہ بزمِ پیرِ مغاں ہے قریب آجاؤ

فرازؔ دُور کے سُورج غروب سمجھے گئے
یہ دَورِ کم نظراں ہے قریب آجاؤ

جانشیں

(۱۹۸۶ء میں کراچی میں طلبا پر فائرنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا

جاہلو!

تم اندھیروں کی دُنیا کے باسی

جہالت کے تاریک غاروں کے مُردے

کہاں جا رہے ہو، کہاں؟

تم تہی دست ہو

تم تہی جیب ہو

تم تہی دامنوں سے ہمیں کوئی لالچ نہیں

تم نہیں جانتے

تم نہیں مانتے

ہم تمہارے لیے

کب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو

منڈیوں میں سجائے ہوئے ہیں

تم نہیں دیکھتے

تم کہ شب کور ہو

ہم نے دن کے اُجالے میں بھی - بس تمہارے لیے

اِس تمدّن کے فانوس روشن کیے

جن کی شفاف کرنوں سے سارا جہاں بقعۂ نُور ہے

عالمِ طُور ہے

پاگلو!

تم نہیں جانتے

تم نہیں مانتے

ہم ارسطو ہیں شاہوں کے اُستاد ہیں

ہم فلاطوں ہیں ہم کو ہر اک علم و حکمت کے گُر یاد ہیں

ہم ہی سقراط ہیں

ہم ہی بقراط ہیں

ہم ہی بے مثل شخصیتوں کے خردمند فرزند ہیں

ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں

سر پھرو!

تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمھیں

خاک و خوں کے سمندر میں نہلا دیا

صرف اپنے تسلط کی خاطر تمھیں

ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹوا دیا

چاند سورج تو اپنے لیے رکھ لیے

اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا

تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں

یہ تسلط یہ جاہ و حشم یہ زمیں

بس تمھارے لیے ہے تمھارے لیے

دَورِ فردا کے فرمانروا ہو تمھیں
تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشیں
پاگلو! ..... ہم سے عالی نظر دیدہ ور
تم سے جو بھی کہیں مان لو
تم نہیں جانتے تم کہ مردہ رہے سالہا سال سے
بھیڑیوں اور درندوں کی ارواحِ بد تم میں در آئی ہیں
اور جہل و جنوں کی نجس مشعلیں دے کے تم کو
بغاوت پہ اُکساتی ہیں
اپنے اجداد سے، اپنے فرمانرواؤں سے، آقاؤں سے
جاہلو!
پاگلو!!